حافظ عبد الحنان کیلانی[1]

علوم اسلامیہ میں مناہج تحقیق

ABSTRACT

Sustainability and development of a man's individual and collective life is related to research. By giving up the creative tendency, the ability of thinking and acting becomes stagnant. It is only possible to satisfy the inborn inclination of striving of man through research. The methods and systems of research have been progressed with the development of learnings and art because every sort of education and art demands a peculiar type of research. Islamic Sciences have separate and comprehensive concepts and applications. In these under review lines, guidance is provided towards those methods and techniques of research, which can possibly be useful and helpful in Islamic research.

تحقیق

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ باب تفعیل سے مصدر ہے۔ اس کے معنی تصدیق، یقین، سچائی، اصلیت ثابت کرنے کے ہیں۔[2]

ڈاکٹر سید عبد اللہ (متوفی 1986ء) رقم طراز ہیں:

"تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔"[3]

عربی زبان میں تحقیق کے لیے 'بحث' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی تلاش اور جستجو کا مفہوم پایا جاتا

1 ریسرچ سکالر، مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، پاکستان

2 فیروز الدین، مولوی، الحاج، فیروز اللغات، مادہ تحقیق: ص348، فیروز سنز، لاہور

3 گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن: ص9، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، 2012ء

ہے جیسا کہ ابن منظور الافریقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 711ھ) کا کہنا ہے:

"البَحْثُ: طَلَبُكَ الشيءَ فِي التُّراب" [1]

"بحث کا مطلب کسی چیز کو مٹی میں سے تلاش کرنا ہے۔"

اسی طرح ڈاکٹر عبد الہادی تحقیق کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جهد علمي يهدف إلي اكتشاف الحقائق الجديدة و التاكد من صحتها، و تحليل العلاقات بين الحقائق المختلفة"[2]

"یہ ایک علمی جہد اور مشقت ہے جس کا مقصد جدید حقائق کی از سر نو دریافت اور انہیں درست طریقے سے ثابت کرنا ہے۔ نیز بر آں یہ ہے کہ مختلف حقائق کے باہمی تعلقات کا تجزیہ و تحلیل کرنا ہے۔"

انگلش میں تحقیق کے حوالے سے عام طور پر دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں: ایک سرچ (Sereach) اور دوسرا ریسرچ (Resereach) ہے۔ اول الذکر میں ابتدائی تحقیق جب کہ ثانی الذکر میں کسی تحقیق شدہ مواد کے نئے پہلو سامنے لانا مقصود ہوتا ہے۔ لغت و ادب کی کتب اس حوالے سے بہتر طریقے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ تاہم عام طور پر اس بارے میں تکنیکی تفریق ملحوظ خاطر نہیں رکھی جاتی۔

منہج کا مفہوم

لغوی معنی

علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 398ھ) لکھتے ہیں:

"النَهْجُ: الطريق الواضح، وكذلك المَنْهَجُ والمِنْهاجُ. وأَنْهَجَ الطريقُ، أي استبانَ وصار نَهْجاً واضحاً بَيِّناً. قال يزيد بن الخذاق العبدى: ولقد أضاءَ لك الطريقُ وأَنْهَجَتْ سُبُلُ المَسالِكِ"[3]

"منہج واضح راستے کو کہتے ہیں۔ منہج اور منہاج کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے اور " أنهج الطريق" کا مطلب ہے راستے کا واضح ترین ہونا۔ یزید بن خذاق عبدی کا کہنا ہے کہ یقیناً آپ پر راستہ روشن ہو گیا۔ یعنی وہ راستے واضح ہو گئے جن پر تو نے چلنا ہے۔"

---

1 ابن منظور الأفريقي، أبو الفضل محمد بن مكرم، لسان العرب:2/ 114، دار صادر، بيروت، الطبعة الثالثة، 1414ھ

2 عبد الهادى، الدكتور، اصول البحث: ص12، مؤسسة دار الكتاب الإسلامى، قم، إيران

3 الجوهري، إسماعيل بن حماد، أبو نصر، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية:1/ 346، دار العلم للملايين، بيروت، الطبعة الرابعة، 1987 م

ابن منظور الافریقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وطُرُقٌ نَهْجَةٌ،... وَفِي التَّنْزِيلِ: لِكُلٍّ جَعَلْنا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهاجاً." [1]

"مناہج سے مراد واضح راستے ہیں... اور قرآن میں ہے: " تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے۔"

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 671ھ) فرماتے ہیں:

"وَالْمِنْهَاجُ الطَّرِيقُ الْمُسْتَمِر" [2]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "منہاج سے مراد وہ راستہ ہے جو مسلسل استعمال کیا جائے۔"

معجم الوسیط کے مؤلفین نے منہج کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"والخطة المرسومة (محدثة) وَمِنْه منهاج الدراسة ومنهاج التَّعْلِيم وَنَحْوهمَا" [3]

"منہج سے مراد طے شدہ منصوبہ ہے۔ اور اسی مفہوم کے پیش نظر کہتے ہیں مطالعہ اور تعلیم کا منہاج وغیرہ۔"

درج بالا توضیحات سے عیاں ہوتا ہے کہ منہج سے مراد ایسا راستہ ہے جو کثرت سے استعمال کیا جاتا ہو اور جو واضح ہو۔

اصطلاحی تعریف

ڈاکٹر عبد الرحمن بدوی لکھتے ہیں:

"بأن لكلمة المنهج استعمالين إحدهما عام و الآخر خاص، وأن مدلولها في الحالتين متقاربان. فالمنهج يأتي بمعني السمة الغالبة علي مجموعة من الظواهر الفكرية أو السلوكية.... وياتي بمعني الطريق أو الطريقة المحددوة التي توصل الإنسان من نقطة إلي نقطة أخرى. لهذا لوقلنا لكل بحث منهج لما اخطانا القول. فالمنهج في البحث يعتبر وحدة متكاملة ذات كيان مستقل، تتألف من أساليب و وسائل معنوية و مادية" [4]

"حقیقت یہ ہے کہ منہج کے کلمہ کے دو استعمالات ہیں: ایک عام اور دوسرا خاص۔ اور دونوں حالتوں میں اس کا

---

1 لسان العرب:2/ 383

2 القرطبي، محمد بن أحمد بن أبي بكر، تحقيق: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، الجامع لأحكام القرآن:6/ 211، دار الكتب المصرية، القاهرة، الطبعة الثانية، 1964 م

3 مجمع اللغة العربية بالقاهرة، المعجم الوسيط :2/ 957، دار إحياء التراث العربي، بيروت

4 بدوى، عبد الرحمٰن، مناهج البحث العلمي:ص5، وكالة المطبوعات، كويت، طبع 1977ء

مدلول قریبی معنی ہی دیتا ہے۔ ایک یہ کہ چند فکری یا عملی مظاہر کے مجموعے کی نمایاں نشانی کو منہج کہتے ہیں...
اسی طرح یہ ایک ایسے محدود راستے کے معنی میں بھی آتا ہے جو انسان کو ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلے تک پہنچائے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ہر تحقیق کو منہج کہہ دیں تو غلط نہ ہوگا۔ چناں چہ منہج تحقیق میں وحدت کو کہا جائے گا جو اپنی ذات میں مکمل اور مستقل ہو اور جو کئی طرح کے ظاہری و معنوی اسالیب و ذرائع پر مشتمل ہو۔"

ڈاکٹر عبد الہادی لکھتے ہیں:

"المنهج مجموعة من القواعد العامةيعتمدها الباحث في تنظيم ما لديه من أفكار أو معلومات من أجل أن توصله إلي النتيجة المطلوبة."[1]

"منہج ان عمومی قواعد کا نام ہے جن کی بنا پر محقق اپنے افکار اور معلومات کو مرتب کرتا ہے۔ جس سے اس کا مقصد اپنے مطلوبہ نتیجہ تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔"

مناہج تحقیق کا آغاز وارتقا

اگر ہم ان قدیم تہذیبوں کا جائزہ لیں کہ جنہوں نے انسانی تمدن اور ثقافت کو فروغ دیا تو ان میں ایک اہم تہذیب مصری تہذیب ہے۔ مصریوں نے سائنسی علوم میں ترقی کے لیے نمایاں کاوشیں کیں۔ اہرام مصر ان کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

دوسری طرف یونانیوں میں ارسطو نے 'قیاسی منہج' کے ایسے قواعد مرتب کیے کہ جن میں مسلمات سے استدلال کا آغاز کر کے مختلف فیہ نتائج اخذ کیے جاتے تھے۔ اس کی طرف سے پیش کیے گئے منطقی اصولوں کو بحث و نظر اور جدل و مکالمات میں صدیوں بطور معیار تصور کیا جاتا رہا۔

مفکرین اور اہل عرب طویل عرصہ مشائی طرز استدلال کی پابندی کرتے رہے۔ اس دوران اہل عرب نے ارسطو کی کتب کے ترجمے کیے، شروحات لکھیں، خلاصے اور اضافے مرتب کیے۔ ایک مدت مدید کے بعد عرب علما کو یہ احساس ہوا کہ ارسطوئی قیاس بعض علوم میں کار آمد نہیں کیوں کہ یہ ایک ریاضیاتی قیاس ہے جو کلی سے شروع ہو کر جزئی پر ختم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ریاضی میں کام دے سکتا ہے تاہم سائنسی اور معاشرتی علوم میں یہ مفید نہیں کیوں کہ یہاں استدلال کی بالکل ہی برعکس صورت حال ہے۔ یہاں جزئیات سے آغاز کر کے کلیات اور عمومیات کی طرف جانا پڑتا ہے۔

بہر حال اس منزل پر پہنچنے کے بعد انسانی فکر نے دائرہ تحقیق میں ایک جداگانہ سفر کا آغاز کیا۔ اب انسان نے عقلی غور و فکر کی دنیا میں مشاہدے اور تجربے کو اہمیت دینا شروع کر دی۔ ایسے علوم کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی جن

1 أصول البحث: ص51

کی اساس استقرا اور تجربے پر تھی مثلاً فلکیات، طبعیات اور کیمیا وغیرہ۔

اہل عرب اور اہل اسلام کے سیاسی زوال کے بعد مغربی دنیا میں احیائے علوم کی تحریک کا آغاز ہوا اور دنیاوی علوم وفنون میں علم و معرفت کی سیادت ان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اہل مغرب یونانی فکر کے اسیر تھے لہٰذا انہوں نے جب عربی علمی میراث کا مطالعہ کیا تو یونانی سحر سے آزاد ہونا شروع ہوئے۔ مغربی سکالرز اور سائنس دانوں نے استقرائی طرزِ استدلال اپنانا شروع کیا۔ فکری جمود ٹوٹنے لگا اور ارسطوئی قیاس کی اہمیت کم ہونے لگی۔

راجر بیکن (متوفی 1294ء) وہ پہلا فلسفی ہے جس نے منطقی قیاس کے بخیے اکھاڑے۔ اس نے حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کے لیے مصنوعی کی بجائے فطری طریقے پر زور دیا۔ اس کے دعوے سے ایک بھونچال پیدا ہو گیا۔ روایتی اور ارسطوئی طرز استدلال کے قائلین اس پر حملہ آور ہو گئے۔ تاہم بظاہر اسے ایک دفعہ دفن کر دیا گیا لیکن زیر سطح ایک ارتعاش ضرور باقی رہا۔ پھر ایک طویل عرصہ بعد فرانسس بیکن (متوفی 1626ء) نے اس لاغر بدن میں روح پھونکی۔ اس نے 'تجرباتی منہج تحقیق کے قواعد' پر ایک کتاب لکھی۔ اس نے واضح کیا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے صحیح راستہ 'استقرائی' ہے جس کی بنا تجربہ اور مضبوط عقلی قیاس ہو۔ بیکن کو جدید منطق کا مؤسس کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈیکارٹ (متوفی 1650ء) آیا۔ اس نے استقرائی کے علاوہ دوسرے ہر منہج کا انکار کر دیا۔ اور تمام علوم کے لیے صرف ایک ہی منہج استدلال کو برحق تسلیم کیا۔[1]

علم و نظر کی دنیا میں درج بالا مناہج استدلال کے حوالے سے طویل عرصہ ایک بحث چلتی رہی کہ جس نے کئی رخ اور رجحان اختیار کیے۔ تاہم بالآخر بیسویں صدی میں دونوں کو ہی تسلیم کر لیا گیا البتہ ہر ایک کا فطری دائرہ متعین کیا گیا۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی اب بھی استقرائی طرز استدلال کو اہمیت زیادہ دی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود عمومی طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ہی انسانی فکر کے رجحانات اور راستے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے فوائد و ثمرات ہیں۔ جب ان میں سے کوئی بھی اپنی فطری حدود سے تجاوز کرتا ہے تو صحتِ نتائج پر حرف آنا شروع ہو جاتا ہے۔

مناہج تحقیق کی اقسام (Types of Research)

مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مناہج تحقیق میں تبدیلی اور ارتقا ہوتا رہا ہے۔ انسان نے حقیقت اور معرفت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تحقیق کے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ جیسے جیسے تحقیق کا میدان بدلتا رہا ویسے ویسے

1 مصطفى حلمي، الدكتور، مناهج البحث في العلوم الانسانية: ص47-50، دار الكتب العلمية، بيروت، 2005ء

اس کے منہاج میں تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے اور یہ عمل ہنوز جاری وساری ہے۔ تحقیق کا تاریخی میدان 'تاریخی منہاج تحقیق' کا متقاضی ہے۔ اسی طرح ایک بیانیہ و وصفی دائرۂ تحقیق کے لیے مناسب ترین منہج تحقیق بھی بیانیہ ہی ہونا چاہیے۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ چند ایسے مناہج تحقیق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جنہیں محققین نے ہمیشہ ہی اپنی مباحث کا محور بنایا ہے۔

اگر ہم اصولِ تحقیق کی کتب میں پیش کردہ مناہج تحقیق کا جائزہ لیں تو انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو خالص اسلامی اور دوسرے وہ جو اسلامی اور مغربی ہر دو طرح کی تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذیل میں پہلے اسلامی اور بعد میں غیر اسلامی مناہج تحقیق کو پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر خالص اسلامی مناہج تحقیق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ ممکنہ طور پر تین طرح کے ہیں۔ جنہیں درایتی، استنباطی اور استسلامی منہج تحقیق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

1۔ درایتی منہج تحقیق

اس سے مراد وہ منہج تحقیق ہے جو حدیث کی صحت وضعف کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محدثین نے الگ سے اصول مرتب کیے ہیں۔ معروف اصطلاحات میں اس فن کو اصول حدیث، علم المصطلح یا درایت حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسماالرجال اور کتب جرح وتعدیل کا ذخیرہ اسی فن کا کرشمہ ہے۔

یہ منہج اپنی حقیقت واصلیت اور روح کے اعتبار سے استقرائی طرز استدلال کا حامل ہے۔ اس میں پہلے تتبع و تلاش اور خوب غور وفکر کے بعد اصول مرتب کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں انتہائی احتیاط کے ساتھ ان کا انطباق و اطلاق کیا گیا ہے۔ اس فن کے بارے میں عموماً جمود کا تاثر دیا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ منہج کے تقاضوں اور شروط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس میں اضافہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مزید برآں یہ کہ اس کے اصولوں کا اطلاق اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر محقق کے سامنے نئی سے نئی گرہیں واضح ہوتی ہیں۔

یہ منہج اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی منہاج سے مختلف ہے۔ حدیث رسول سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس میں سند کی تحقیق کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے جب کہ تاریخ میں اس بات کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ اگرچہ چند مؤرخین نے بھی کتب تاریخ میں سند کی طرف التفات کیا ہے تاہم وہ سلسلہ اسانید اس درجہ استحکام اور مضبوطی کو نہیں پہنچ سکا۔

گزشتہ صدی میں تاریخی منہاج تحقیق اور کسی واقعہ کے رونما ہونے کے لحاظ سے قانونی اعتبار سے بحث و نظر کے نئے گوشے سامنے آنے کی وجہ سے بعض اربابِ دانش کی طرف سے درایتی منہاج تحقیق کو بھی تاریخی اور

قانونی منہج تحقیق کے سانچے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر طفیل ہاشمی لکھتے ہیں:

"کسی واقعہ کی صحت کو جانچنے کے لیے یہی کافی نہیں ہوتا کہ اس کو بیان کرنے والا شخص قابل اعتماد ہے۔ بل کہ اگر وہ واقعہ ایسا ہے کہ عام تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، عقل اس کے وقوع کو تسلیم نہیں کرتی یا جس شخص سے وہ واقعہ منسوب کیا گیا ہے اس کی عام زندگی اس کے وقوع پذیر ہونے سے ابا کرتی ہے تو اس واقعے کی صداقت جانچنے کے لیے مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہوتی ہے۔ روایت حدیث میں چوں کہ راوی کے فہم و سماع کی وجہ سے فرق پڑنے کا امکان ہوتا ہے اور جوں جوں سلسلۂ سند طویل ہو یہ امکان اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ مزید بر آں وضع حدیث کی وجہ سے یہ تحقیق اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لیے محدثین و فقہانے قبول روایت کے لیے متن حدیث کی تحقیق کے بھی اصول وضع کیے ہیں۔"[1]

لیکن فن درایت حدیث کا میدان مختلف ہونے کی بنا پر اس فن کی اساس خبر و روایت پر ہے۔ اس میں تحقیق و تفتیش کے حوالے سے بنیادی حیثیت سند و روایت کو دی جاتی ہے جب کہ متن من حیث المتن یا واقعہ من حیث الواقعہ کو بھی اگر اس میں اہمیت دی جاتی ہے تو وہ بھی سند کی قبیل سے ہی دی جاتی ہے۔ چناں چہ ائمہ حدیث نے تحقیق کے اسی منہج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 181ھ) فرماتے ہیں:

"بيننا وبين القوم القوائم يعني الاسناد"[2]

"ہمارے درمیان اور لوگوں کے درمیان مضبوط بنیادیں ہیں یعنی اسناد ہیں۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 204ھ) فرماتے ہیں:

"مثل الذي يطلب الحديث بلا اسناد كمثل حاطب ليل يحمل حزمة حطب وفيه أفعي ولا يدري"[3]

"بلاسند حدیث طلب کرنے والے کی مثال رات کو لکڑیاں چننے والے اس شخص کی طرح ہے جو لکڑیوں کی گٹھری اٹھاتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ اس میں ایک سانپ بھی چھپا ہوا ہے۔"

---

1 طفیل ہاشمی، ڈاکٹر، اسلام میں تحقیق کے اصول و مبادی: ص40، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

2 القشيري، أبو الحسين مسلم بن حجاج، مقدمه صحيح مسلم: ص88، دار الفكر، بيروت

3 الحاكم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النيسابوري، المدخل إلى علم الصحيح: ص2، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 1404ھ

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 160ھ) کا قول ہے:

"كل حديث ليس فيه أنا وحدثنا فهو خل وبقل"[1]

"ہر وہ حدیث جس میں "أنا" اور "حدثنا" نہیں وہ سرکہ اور سبزی کی مانند ہے۔"

2۔ استنباطی منہج تحقیق

اس سے مراد وہ منہج ہے جس میں ایک محقق نصوص کے مطالعے اور تفہیم میں عقلی و نفسیاتی اعتبار سے انتہائی زیادہ محنت کرتا ہے۔ ایک مسئلہ کے متعلقہ تمام نصوص کا تجزیہ و تحلیل کر کے ان سے اصول نکالتا ہے۔ اور پھر انہیں واضح دلائل کے ساتھ مضبوط کرتا ہے۔ مسلم فقہا نے اسلامی تعلیمات کی راہنمائی اور دائرے میں رہتے ہوئے تین مناہج استنباط اپنائے ہیں جنہیں اہل حدیث، اہل رائے اور اہل ظاہر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ نوعیت کا منہج استنباط ہے تاہم ہر منہج شرعی تعلیمات کے دائرے میں محدود ہے۔ اس سلسلے میں جس فن سے معاونت لی جاتی ہے اسے علم 'اصول فقہ' کہتے ہیں۔ قرآن میں استنباط کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ﴾[2]

"یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوفناک خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔"

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 310ھ) فرماتے ہیں:

"وكل مستخرج شيئًا كان مستترًا عن أبصار العيون أو عن معارف القلوب، فهو له: "مستنبط"، يقال: "استنبطت الركية"، إذا استخرجت ماءها، "ونَبَطتها أنبطها"، و"النَّبَط"، الماء المستنبط من الأرض"[3]

"استنباط سے مراد ہر اس چیز کو نکالنا ہے جو بصارت یا بصیرت سے پوشیدہ ہو اور جب آپ کنویں سے پانی نکالیں تو

---

1 خطيب بغدادي، أبوبكر أحمد بن علي بن ثابت، الكفاية في علم الرواية: ص283، دار الكتب الحديث، القاهرة

2 النساء: 83

3 الطبري، محمد بن جرير بن يزيد، أبو جعفر، المحقق أحمد محمد شاكر، جامع البيان في تأويل القرآن: 8/ 571، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، 2000م

اس کے لیے 'استنبطت الرکیۃ' بولا جاتا ہے۔ اور 'نبط الماء' سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے نکالا جائے۔"

درج بالا تصریحات سے عیاں ہوتا ہے کہ استنباطی عمل سخت ترین عقلی محنت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک محقق اپنے دائرۂ تحقیق میں نصوص شرعیہ کے صحیح معانی کا ادراک حاصل کرنے کی بھرپور سعی کرتا ہے۔ انہیں ان کے حقیقی معانی پر محمول کرنے کے بعد تجزیہ و تحلیل سے کام لیتا ہے۔ پھر ان سے بنیادی اصول و نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور آخر میں ان نتائج کو مضبوط، واضح اور مقبول دلائل کے ساتھ مستحکم کرتا ہے۔ یہ ایک نوعیت سے اجتہادی کاوش ہے۔ اس منہج کے درست استعمال کے لیے فن 'اصول فقہ' سے شناسائی لازمی ہے۔

اسلامی منہاج تحقیق میں استنباطی منہج استخراجی اور استقرائی ہر دو طرح کے طرز استدلال پر محیط ہے۔ تاہم اس میں غالب رجحان استخراج کو ہی حاصل ہے۔ اس میں نصوص کے مطالعہ اور تتبع و تلاش کے بعد اصول مرتب کیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں ان طے شدہ اصولوں کی روشنی میں ایک لحاظ سے کلی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

3۔ استسلامی منہج تحقیق

اس منہج تحقیق کے حوالے سے 'مجوزہ' اصطلاح میں اگرچہ رد و قدح کی جاسکتی ہے تاہم اس میں پیش کردہ فکر ایک حقیقت اور عصری تقاضہ ہے۔ استسلامی منہج تحقیق سے مراد مغربی علوم و فنون کو اسلامی مثالیہ (Paradaim) میں ڈھالنا ہے۔ انہیں اسلامی نظریہ حیات کے مطابق شکل دینا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے اہل مغرب نے جہاں مادی اور عسکری میدان میں تفوق و برتری حاصل کی ہے وہاں انہوں نے علوم و فنون کے دائرہ کار میں بھی نئی جہات متعارف کرائی ہیں۔ وہ اپنی تحقیقی کاوشوں کی بدولت کئی طرح کے فنی شاہکار سامنے لانے کے قابل ہوئے ہیں۔

اہل مغرب ایک مخصوص طرز کے مادی نظریہ حیات کے حامل ہیں۔ اور ان کے تمام تر علوم و فنون میں اسی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کی تعبیر اور روح مادیت پرستی کے گرد ہی گھومتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود غازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 2010ء) رقم طراز ہیں:

"آج کل کے مغربی علوم و فنون کو ہی لیجیے۔ اس وقت مغربی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ جو علوم دنیا میں رائج ہیں وہ تمام تر مغرب کے مخصوص فکری سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں، مغرب کا استعماری رنگ مکمل طور پر رچا بسا ہوا ہے۔ علوم طبعی اور علوم حسی تو خیر خدا بیزار اور وحی و الہام کی راہنمائی سے برگشتہ ہیں ہی، علوم عمرانی و اجتماعی بھی

اس معاملہ میں پیچھے نہیں۔"[1]

اگرچہ اہل مغرب کی اس خدا بیزاری اور مادیت پرستی کے مخصوص تاریخی اسباب ہیں۔ سر دست ان کا تعین اور ان کی طرف نشاندہی کرنا مقصود نہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مغربی دنیا کا ہر علم و فن اس طرز فکر کے مطابق استوار ہے۔ فطری علوم (Natural Science) ہو یا سماجی علوم (Social Sciences) سبھی اسی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے عمومی طور پر اہل مغرب کی طرز حیات کا ہر پہلو الحاد و دہریت کے تعفن سے اٹا ہوا ہے۔

چناں چہ ہمیں مغربی علوم و فنون کی اسلام کاری کرنے کے لیے دو مرحلوں سے گزرنا چاہیے۔ اولاً یہ کہ ان تمام کا تنقیدی مطالعہ کر کے ان میں سے کھرا اور کھوٹا الگ کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد ان کی تشکیل جدید کی جائے۔ ان میں سے جو چیز تعمیری، مثبت اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو اسے لے لیا جائے۔ اور جو چیز تخریبی، منفی اور شریعتِ اسلامیہ کے مخالف ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ اسی کی طرف ڈاکٹر محمود غازی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ اور انہوں نے پہلے مرحلے کو تطہیر فکر جب کہ دوسرے کو تعمیر فکر کا نام دیا ہے:

"تطہیر فکر سے مراد رائج الوقت علوم و فنون کا اسلامی نقطہ نظر سے تنقیدی جائزہ لے کر کھرا اور کھوٹا الگ کر دینا اس میں شامل ہے۔"[2]

ہمارے ہاں اہل مغرب اور مغربی علوم و فنون کے بارے میں عمومی طور پر جو روش پائی جاتی ہے وہ تقلید و اتباع کی ہے۔ مغرب سے درآمد شدہ ہر چیز کو بغیر تحقیق و تشکیک کے حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس پر جرات تنقید کو حماقت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ رویہ اہل مشرق کے لیے یقیناً زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں اور اسلاف کے ورثہ پر اعتماد کرتے ہوئے اہل مغرب کی ہر چیز کو تشکیکی انداز میں دیکھنا ہو گا۔

واضح رہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز پہلی ہی نظر مسترد قرار دے دیں اور اسے ناقابل التفات ٹھہرا دیں۔ اور اس کے بارے میں سخت نوعیت کے فتاویٰ صادر کرنے شروع کر دیں۔ ان دونوں انتہائی رویوں کے نتائج سے تاریخ ہمیں سبق سکھا چکی ہے۔ دیدۂ عبرت کے لیے اس میں بہت کچھ پنہاں ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی معقولیت پر مبنی انداز ہائے فکر معلوم نہیں ہوتے۔ چناں چہ دعویٰ اور مخالف دعویٰ کے تصادم سے یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ مغربی علوم و فنون کو یک نظر مسترد کرنے کی بجائے انہیں تنقیدی اسلوب میں پڑھنا چاہیے۔ ان میں سے جو چیز اسلام اور اسلامی تعلیمات کے موافق محسوس ہو اسے دوسری سے ممتاز کر

1 محمود احمد غازی، ڈاکٹر، ادب القاضی: ص 15، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، طبع سوم، 1999ء

2 ادب القاضی: ص 15

دیناچاہیے۔

مغربی علوم وفنون کے بارے میں دوسرا مرحلہ تعمیر فکر ہے کہ وہ افکار و نظریات یا فنون جو اسلام کی مجموعی ہیئت اور جزوی تعلیمات سے لگا کھاتے ہیں کہ جن کی اسلام کار ممکن ہو سکتی ہے انہیں اسلامیانے میں لایا جائے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"تعمیر فکر سے مراد یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تمام علوم وفنون کی ترتیب نو اور تشکیل جدید۔ اس میں جدید علوم کی تشکیل جدید بھی شامل ہے اور قدیم اسلامی علوم کی تعمیر نو بھی۔ قرآن و سنت کے غیر متغیر اور قابل تبدل اصولوں کی روشنی میں علوم کو اس طرح مرتب کرنا کہ وہ عصر حاضر میں ہمارے لیے کار آمد ثابت ہو سکیں اور ایک ایسے نظام فکر و عمل اور تہذیب و تمدن کی تعمیر میں مدد دے سکیں جو عصر حاضر میں دنیا کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دے سکیں۔ ﴿ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ ﴾ تاکہ اللہ کی حجت دنیا والوں پر تمام ہو سکے۔ اور کوئی شخص اللہ کے خلاف کوئی حجت پیش نہ کر سکے۔"[1]

اس سلسلے میں ذہن نشیں رہے کہ قبل ازیں ماضی میں فلسفہ یونان سے ہمارے اسلاف کو ایسا ہی واسطہ پڑ چکا ہے۔ اسلاف کی اس کے ساتھ کش مکش طویل صدیوں پر مشتمل ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ بالآخر ہم سرخرو ہوئے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تاریخی ورثہ سے بھی بھرپور استفادہ کیا جائے کیوں کہ ایک تو یہ ہے کہ اہل مغرب کی بھی فکری و فلسفیانہ اساس افکار یونان ہی ہیں جب کہ دوسری طرف اسلاف اس پر اچھی طرح رد وقدح کر چکے ہیں۔ اس میں سے کھرے دکھوٹے کی تفریق اور صحیح وغلط کے مابین امتیاز بحسن وخوبی ہو چکا ہے۔

ائمہ اسلاف نے جن طرز ہائے فکر یا مناہج کے مطابق فلسفہ یونان کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے سب سے زیادہ مستحکم اور اقرب الی الکتاب والسنۃ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (متوفی 728ھ) کا منہج ہے۔ دریں اثنا امام صاحب جابجا کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہمیں عقلی دلائل کے لیے یونانی عقلیات کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کتاب وسنت سے استفادہ کرنا چاہیے کیوں کہ اس کے دلائل سب سے زیادہ عقلی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

" وَالْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ يَدُلُّ بِالْإِخْبَارِ تَارَةً، وَيَدُلُّ بِالتَّنْبِيهِ تَارَةً، وَالْإِرْشَادِ وَالْبَيَانِ لِلْأَدِلَّةِ الْعَقْلِيَّةِ تَارَةً، وَخُلَاصَةُ مَا عِنْدَ أَرْبَابِ النَّظَرِ الْعَقْلِيِّ فِي الْإِلَهِيَّاتِ مِنَ الْأَدِلَّةِ الْيَقِينِيَّةِ وَالْمَعَارِفِ الْإِلَهِيَّةِ قَدْ جَاءَ بِهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ، مَعَ زِيَادَاتٍ وَتَكْمِيلَاتٍ لَمْ يَهْتَدِ إِلَيْهَا إِلَّا مَنْ هَدَاهُ اللهُ بِخِطَابِهِ، فَكَانَ فِيمَا جَاءَ بِهِ الرَّسُولُ مِنَ الْأَدِلَّةِ الْعَقْلِيَّةِ وَالْمَعَارِفِ الْيَقِينِيَّةِ فَوْقَ مَا فِي عُقُولِ جَمِيعِ الْعُقَلَاءِ مِنَ الْأَوَّلِينَ

1 ادب القاضی: ص 15

وَالْآخِرِينَ"[1]

"اور کتاب و سنت عقلی دلائل کی طرف بعض اوقات خبر، انتباہ، رہنمائی، بیان و توضیح میں سے کسی ایک طریقے سے روشنی ڈالتے ہیں۔ مختصر بات یہ ہے کہ ارباب نظر و فکر کے ہاں کتاب و سنت میں الٰہیات کے حوالے سے عقلی و یقینی دلائل موجود ہیں۔ بلکہ ان میں اضافہ و تکمیل بھی ہے لیکن صرف وہی لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں جنہیں اللہ ہدایت دے۔ ایسے ہی رسول ﷺ جو عقلی دلائل لے کر آئے ہیں وہ تمام زمانوں کے عقل مندوں کی عقلیات سے برتر ہیں۔"

اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریچر سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ یہ محض ایک دعویٰ ہی نہیں تھا بل کہ اسے پختہ دلائل کے ساتھ بہترین طریقے سے مضبوط اور مزین کیا۔ اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"فإن الكتاب – والرسول – وإن كان يخبر أحياناً بخبر مجرد، كما يأمر أحياناً بأمر مجرد، فهو يذكر مع إخباره عن الله تعالى وملائكته وكتبه ورسله، من الدلالة والبيان والهدى والإرشاد، ما يبين الطرق التي يعلم لها ثبوت ذلك، وما يهدي القلوب ويدل العقول على معرفة ذلك، ويذكر من الآيات والأمثال المضروبة، التي هي مقاييس عقلية وبراهين يقينية، ما لا يمكن أن يذكر أحد من أهل الكلام والفلسفة ما يقاربه، فضلاً عن ذكر ما يماثله أو يفضل عليه. ومن تدبر ذلك رأى أنه لم يذكر أحد – طريقاً عقلياً يعرف به وجود الصانع، أو شيء من أحواله – من أهل الكلام والفلاسفة إلا وقد جاء القرآن بما هو خير منه وأكمل وأنفع وأقوى وأقطع، بتقدير صحة ما يذكره هؤلاء"[2]

حقیقت یہ ہے کتاب و سنت اگرچہ بعض اوقات صرف حکم یا خبر دے رہے ہوتے ہیں۔ جس میں وہ اللہ، فرشتے، کتب اور رسولوں کے بارے میں آگاہ کر رہے ہوتے ہیں۔ خبر دینے کے علاوہ ایسی ہدایت پر رہنمائی اور دلالت کے موجود ہوتی ہے کہ جس سے خالق، رسولوں، فرشتوں اور کتابوں کا اثبات ہوتا ہے اور جو خالق کی معرفت کے باب میں دل کی ہدایت اور عقل کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور کتاب و سنت میں ایسی آیات اور مثالیں بیان کی جاتی ہیں جو ایسی یقینی برہان اور عقلی قیاس پر مبنی ہوتی ہیں کہ جن کے قریب قریب کا بھی ذکر ہمیں فلاسفہ اور متکلمین کے کلام میں نہیں ملتا چہ جائیکہ اس کے برابر یا اس سے بہتر کا ذکر ہو۔ جس نے بھی اس بارے اچھی طرح

---

[1] ابن تيمية، أحمد بن عبد الحليم، أبو العباس، منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرية: 2/ 110، جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الطبعة الأولى، 1986 م

[2] ابن تيمية، تقي الدين أحمد بن عبد الحليم، أبو العباس، تحقيق الدكتور محمد رشاد سالم، درء تعارض العقل والنقل: 7/ 352، جامعة الإمام محمد بن سعود، المملكة العربية، الطبعة الثانية، 1991م

غور و فکر کیا تو وہ اس نتیجے تک پہنچ جائے گا کہ فلاسفہ اور متکلمین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ اس نے خالق کے وجود کے بارے میں کچھ عقل کلام کیا ہو اور قرآن مجید نے اس کے کلام سے بہتر، اکمل، زیادہ نفع بخش، زیادہ مضبوط اور زیادہ قطعی دلیل بیان نہ کی ہو۔"

اگرچہ معاصر مغربی علوم کے بہت زیادہ گوشے نئے ہیں۔ طرزِ فکر میں بھی بہت تبدیلی آچکی ہے۔ استخراج کی بجائے استقرا پر زیادہ زور ہے جب کہ دوسری طرف اسلاف نے جس فلسفہ فکر کا سامنا کیا تھا اس میں استخراجی طرزِ فکر کو مرکزی حیثیت تھی۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو ایک جداگانہ علم کلام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب و سنت اپنے زمانہ نزول سے لے کر آج تک ایک ہی ہیں۔ ان کی تعلیمات، طرز ہائے استدلال وغیرہ سبھی کچھ جوں کا توں ہے۔ بس عصری تقاضوں کے مطابق ان میں مزید وسعتیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ اس پہلو سے دیکھا جائے تو شرعی طرز استدلال کے بارے میں ہم امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں۔ ان کے واضح کردہ منہج کو مغربی فکر کے بالمقال بکثرت استعمال کر سکتے ہیں۔

مشترکہ مناہج تحقیق

اس سے مراد وہ مناہج تحقیق ہیں جو مغربی اور اسلامی علوم میں سے ہر دو کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں انہیں اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

4۔ تقابلی منہج تحقیق

تقابلی منہج تحقیق سے مراد دو اشیاء یا واقعات کے درمیان موازنہ کرنا ہے۔ ان کی باہمی خصوصیات اور صفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے درمیان تعلق و رابطہ کو تلاش کرنا ہے۔ اور ان کے آپس میں ایک دوسرے پر مثبت و منفی اثر واضح کرنا ہے۔ تقابلی، تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ کے لیے اس منہج کو استعمال کیا جاتا ہے۔ علامہ ابن خلدون (متوفی 808ھ) فرماتے ہیں:

" اس میں ایک محقق کو اقوام، علاقے، شہر، اخلاق، رسومات، مذاہب اور تمام احوال کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ ان کا باہمی موازنہ کرتے ہوئے مشترکات کو تلاش کرے۔ نیز بر آں یہ ہے کہ متفقہ اور مختلف توجیہات کی نشاندہی کرے۔"[1]

علوم اسلامیہ میں بھی تحقیق کے دوران مختلف علوم اور اصولوں کا باہمی طور پر تقابل کرنا بطور منہج شامل ہے۔

1 أصول البحث: ص63

جیسا کہ ڈاکٹر عبد الہادی لکھتے ہیں:

"ومنه القيام بالدراسات المقارنة في شتي المجالات الأصولية أو الفقهية أو الحديثة"

"اسلامی تناظر میں مختلف میدانوں میں تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جیسے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث وغیرہ ہیں"

7۔ تاریخی منہج تحقیق (Historical Research)

جب ہم تاریخ کا مطالعہ و تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں تاریخی منہج تحقیق اپنانا پڑتا ہے۔ جس میں گزشتہ واقعات کی اس طریقے سے ترتیب و توجیہ کرنا ہوتی ہے کہ پیش آمدہ مشکل کو حل کرنے میں مستقبل کے اعتبار سے راہنمائی ملے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے۔ حال میں جو مسئلہ ہمیں درپیش ہو اس کے نظائر ماضی میں یقیناً گزر چکے ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں تشابہ واقعات کی نشاندہی اور درست اسباب و عوامل کا تعین کر کے آئندہ کے لیے راہنمائی لینا اسی منہج تحقیق میں زیر بحث لایا جاتا ہے۔

اور اگر خالص اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس منہج تحقیق میں مسلم شخصیات کی سوانح حیات اور آغاز اسلام سے لے کر ابھی تک کی اسلامی تاریخ کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے موضوعات کو صرف ان کی اہمیت و افادیت کی بنیاد پر تحقیق کے لیے منتخب کرنا چاہیے۔ موضوع اختیار کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ حال اور مستقبل میں ملتِ اسلامیہ کے لیے وہ کن کن پہلوؤں سے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک تاریخی منہاج تحقیق کو اپناتے ہوئے مختلف نوعیت کی دستاویزات اور تہذیبی و تمدنی آثار کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس منہج کو اپناتے ہوئے ایک محقق کو ذاتی میلانات اور تعصب سے دور رہنے کا خصوصی طور پر خیال کرنا چاہیے۔ جو بات اس کے نقطۂ نظر کے معارض ہو، اسے بیان کرے اور ایک علمی انداز میں اس کی تردید کرے۔ تحقیق کے اس میدان کے لیے حکومتی رجسٹرز و دیوان، ذاتی یادداشتیں اور تاریخ پر لکھی گئی کتب بنیادی مصادر کی اہمیت رکھتے ہوتے ہیں۔

8۔ بیانیہ (وصفی) منہج تحقیق (Descriptive Research)

اس سے مراد وہ منہج تحقیق ہے جس میں پیش آنے والے حالیہ حادثات و واقعات کو بیان کیا جائے۔ پہلے ایک محقق حالات کا بغور مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر ان کا تجزیہ و تحلیل اور توجیہ و تعلیل کر کے متوقع امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور بالآخر ان میں بہتر حل کی طرف راہنمائی بھی دیتا ہے۔ اسی طرح کسی مخصوص علمی موقف سے متعلق حقائق کا تعارف کروانا، اس سے متعلقہ تمام آرا کا احاطہ کرنا، ان کی تفسیر و توضیح اور تجزیہ و تعلیل کرنا بھی اسی منہج میں شامل ہے۔ چناں چہ اس ضمن میں اولاً ہر دو پہلو سے محقق ساری بحث کو سامنے لاتا ہے۔ پھر اس کی صفات

وخصوصیات اور موثر عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک حل پیش کرتا ہے۔

اہل مغرب کے ہاں یہ منہج اجتماعی علوم (Social Science) کے متعلق درپیش مشکلات حل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ علوم اسلامیہ میں بھی اس منہج تحقیق کا بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی مخصوص علمی میدان میں مختلف آرا کو پیش کرنا اور پھر ان کے درمیان باہمی طور تقابل و تجزیہ یا ان کا تنقیدی اعتبار سے جائزہ لینا۔ ان کی تحقیقی واثباتی حیثیت کو جانچنے کی کوشش کرنا وغیرہ یہ سب اسی منہج کے تحت ہوتا ہے۔ اس منہج تحقیق میں مختلف اشیا کے درمیان موازنہ کرنا پڑتا ہے۔ جس میں متجانسین، بیک وقت یکساں کردار ادا کرنے والی چیزیں یا مسلمہ نظریات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

بیانیہ منہج کی خصوصیات

ایک بیانیہ منہج کی خصوصیات کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

① بیانیہ منہج میں مختلف اشیا کی حقیقت کے بارے میں ایسا تعلق ورشتہ تلاش کیا جاتا ہے جو پہلے سامنے نہ آیا ہو۔ محقق کا مقصد ان تعلقات کا تجزیہ و تحلیل ہوتا ہے۔

② اشیا کے باہمی رشتے کو درست طریقے سے تلاش کر کے اس کے بارے میں تجاویز اور آرا دی جاتی ہیں۔

③ اس منہج میں زیادہ تر منطق کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعے عمومی قواعد تک رسائی حاصل کی جاتی ہے، چاہے وہ استقرائی ہو یا استخراجی۔

④ ایسے مفروضے اور آرا مسترد کر دی جاتی ہیں جو درست نہ ہوں۔

⑤ مختلف مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ حسب استطاعت انہیں بڑی لطافت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ جن کا مقصد بعد ازاں محققین کے لیے ان کی افادیت بڑھانا ہوتا ہے۔[1]

اس منہج تحقیق کو 'بیانیہ' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا عملی و تطبیقی میدان سے تعلق نہیں ہے جب کہ اس کے برعکس تجرباتی منہاج کا سارا معاملہ ہی عمل و تطبیق سے متعلق ہے۔

9۔ میکانکی منہج تحقیق

اس سے مراد وہ تحقیقی منہج ہے جو مقصود بالذات تو نہ ہو لیکن تحقیق و تفکیر میں مدد دے سکے جیسے قوامیس کی ترتیب، فہرستوں کی تیاری، قدیم مخطوطات کی نشر واشاعت وغیرہ۔ ڈاکٹر رفیع الدین فرماتے ہیں:

1 عبد الوهاب إبراهيم، أبو سليمان، كتابة البحث العلمي صياغة جديدة: ص33، 34، دار الشروق، جدة، سعودية، الطبعة الرابعة، 1992ء

"مقدس کتابوں یا مقدس کتابوں پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کی کوئی لغات یا کوئی اشاریہ تیار کرنا یا اس کے مشتملات کا ترجمہ کرنا یا ان کو نئی ترتیب دینا یا ان کا اختصار لکھنا یا کسی ایسے تاریخی قسم کے یا کسی اور نوعیت کے مواد کا جو ان کے مضمون سے تعلق رکھتا ہو اس غرض سے جمع کرنا کہ اس کے حوالے سے آسانی میسر آجائے۔ یہ میکانکی اسلامی تحقیق ہے۔"[1]

خلاصہ بحث

کسی بھی مسئلے پر تحقیق کرتے وقت متعلقہ خاص منہج سے کام لیا جانا چاہیے۔ مثلاً اگر تاریخ کی بابت تحقیق کرنی ہوتی ہے تو خاص تاریخی منہج پر تحقیق کی جاتی ہے۔ اور اگر کسی طبعی و سائنسی مسئلے پر تحقیق کرنی مقصود ہوتی ہے تو تجرباتی منہج تحقیق سے کام لیا جاتا ہے۔ بہر حال ہر تحقیق کے لیے متعلقہ خاص منہج استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم بہتر یہی ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ کو ایک سے زائد ممکنہ تحقیق کے پہلو سے دیکھا جائے۔ یقینی حل اور حتمی نتائج تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کثیر مناہج کے مطابق پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس سلسلے میں مطلوبہ ہدف کی خاطر جہاں کہیں سے معاونت کی صورت نکلے اسے ضرور نکالیں۔ کسی مسئلے کی تحقیق کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ مسئلہ کن باتوں سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ اچھی تحقیق وہی ہوتی ہے جس میں تمام ممکنہ مناہج کام میں لائے جائیں اور مسئلے کو ان کی مدد سے ثابت کیا جائے لیکن بلاشبہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مسئلہ میں مرکزیت صرف متعلقہ منہج کو حاصل ہوتی ہے۔ اور وہی سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہوتا ہے اور اسی کے مطابق بحث و نظر کو آگے بڑھانا چاہیے۔

1 رفیع الدین، ڈاکٹر، اسلامی تحقیق کا مفہوم مدعا اور طریق کار: ص6، دارالاشاعت الاسلامیہ، لاہور